Urdu Studies
An international, peer-reviewed,
bilingual research journal
ISSN: 2583-8784 (Online)
Vol. 5 | Issue 1 | Year 2025
Pages: 50-60

این میری شمل کی یاد میں

سید سراج الدین

Abstract. This reminiscence offers a heartfelt and intimate portrait of Prof. Annemarie Schimmel, penned by one of her closest associates. It moves beyond her towering academic achievements to illuminate the depth of her personality—her humility, spiritual depth, unwavering discipline, and affection for diverse cultures. Through personal anecdotes and reflective insights, the writer captures Schimmel's quiet charisma, her profound devotion to Islamic mysticism, and her ability to connect across linguistic, cultural, and spiritual boundaries. The narrative reveals not only the scholar but the human being behind the scholarship: generous, introspective, and deeply compassionate. This remembrance stands as a tribute to her enduring intellectual legacy and the lasting emotional impression she left on those who knew her well.[1]

Keywords. Annemarie Schimmel.

ڈاکٹر این میری شمل جہاں گرد تھیں، کہاں کہاں وہ نہیں گئیں، ہالینڈ، سویٹزرلینڈ، سویڈن، ترکی مصر، ایران، افغانستان، پاکستان، ہندوستان، ترکستان، انگلستان، امریکہ اور بھی ملک شاید ہوں گے۔ لیکن آج سے بائیس تئیس سال پہلے کسے خیال تھا کہ ان کے قدم سرزمینِ دکن اور شہر حیدر آباد پہنچیں

[1]Abstract prepared by Arshad Masood Hashmi (Ed.).

ISSN: 2583-8784 (Online)
Included in UGC-CARE List since October 2021
Published on August 11, 2025
http://www.urdustudies.in
https://creativecommons.org/licenses/by-nc-nd/4.0/?ref=chooser-v1

گے۔ ان کا سلسلہ حیدر آباد سے کچھ تھا ضرور۔ وہ عالم خوندمیری مرحوم کے پی ایچ ڈی مقالے کی نگراں تھیں اور غالباً ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب سے ان کی راہ و رسم تھی۔ بہر حال کسی نے میکس مولر بھون سے کہا کہ انھیں بلایا جائے اور وہ ۱۹۷۹ء میں پہلی دفعہ حیدر آباد آئیں اور جیسا کہ ان کا دستور تھا ہر پرانے، تاریخی شہر سے انھیں محبت ہو جاتی تھی، وہی حیدر آباد کے ساتھ ہوا۔ ۷۹ء میں عالم زندہ تھے اور اقبال اکیڈیمی میں جو لکچر شمل کا ہوا اس کی صدارت انھوں نے ہی کی تھی۔ باقی چار بار اعزاز مجھے نصیب ہوا۔ مجھے اپنی زندگی میں تین چار مشاہیر سے واقفیت اور قربت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ان میں آنا مری شمل سب سے زیادہ مشہور عالم تھیں۔ یہ سب اونچے ذہن کے لوگ تھے اور ان سے اپنی قربت جس میں ان کی محبت شامل تھی، کے بارے میں سوچتا ہوں تو ایک reflected glory کا احساس ہوتا ہے غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے:

ہوا ہے، شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب سے پروفیسر شمل کا خصوصی تعلق تھا۔ وہ انھیں اپنا خلیفہ لکھتی تھی اور خود کو "الفقیرۃ الی رحمتہ ربی"۔ ان میں واقعی ایک فقیری تھی۔ "فقر" اسلام کی بہت بڑی قدر رہا ہے۔ ع "سلطنت اہل دل فقر ہے شاہی نہیں"۔ این میری شملنے میرے ساتھ بڑی یگانگت اور محبت کا سلوک کیا۔ کچھ کتابیں مجھے تحفہ دیں۔ جب وہ پہلی دفعہ حیدر آباد آئیں تو اقبال اکیڈمی میں ان کے لکچر کے بعد ایک نشست میکس مولر کے گیسٹ ہاؤس میں جو ہمایوں نگر میں پہاڑ پر واقع ایک بہت خوبصورت مکان میں کرائے پر تھا، رکھی گئی تھی۔ وہاں میں اپنے ساتھ امّ حبیبہ کا ایک کیسٹ لے گیا تھا۔ اس کیسٹ میں ام حبیبہ نے جامی کی نعت ع "بلبل زِ تو آموختۃ شیریں سخنی را" بغیر ساز کے اس قدر دلکش آواز میں گائی ہے کہ جس کی داد دینی مشکل ہے۔ شمل نے اس کیسٹ کو بار بار سنا اور وجد کرتی رہیں۔ ان کی اس ادا نے اس شام کو یادگار بنا دیا۔ میں نے ان کو آخری بار دسمبر ۹۷ء میں لندن میں دیکھا۔ وہاں ان کو وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزم میں ایک لکچر دینا تھا۔ غالباً چھ یا سات بجے شام لکچر سے پہلے انھوں نے مجھے اور ڈاکٹر شکیب کو ایک ریسٹورنٹ پر کھانا کھلایا۔ ٹھیک وقت پر ایک مختصر سے رسمی تعارف کے بعد

مائیک کے سامنے جا کھڑی ہوئیں، آنکھیں بند کر لیں جس کے معنی یہ تھے کہ لکچر شروع ہو گیا۔ ٹھیک ایک گھنٹہ بعد انھوں نے آنکھیں کھول دیں جس کے معنی یہ تھے کہ لکچر ختم ہو گیا۔ صرف میں نے بلکہ کسی نے بھی ایسی تقریر نہیں سنی ہو گی جو آنکھیں بند کر کے دی جائے اور اس میں نہ کہیں کوئی جھول ہو نہ پس و پیش۔ جولائی ۹۹ء میں شمل لندن آئی تھیں۔ اس وقت میں بھی وہیں تھا۔ شکیب صاحب کے ہاں ادیبوں اور عالموں کی محفل تھی جس میں میں بھی مدعو تھا۔ لیکن یہ ایسے روز تھی کہ دوسرے دن صبح مجھے امریکہ جانا تھا۔ میری فلائٹ صبح ۶ بجے تھی اور ۳ بجے مجھے گھر سے نکلنا تھا۔ شکیب صاحب کی محفلیں بارہ ایک بجے سے پہلے ختم نہیں ہوتیں، اس لیے میں نے معذرت کر لی۔ میرے نہ ہونے سے اس محفل میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن شمل نے فون کیا اور کہا کہ تمہاری کمی بہت محسوس ہو رہی ہے۔ اتنے محبت بھرے لہجے میں بات کی کہ میں بھول نہیں سکتا۔

شمل نے اپنا امریکن کونسل آف لرینڈ سوسائٹیز کا ہیسکنز Haskins لکچر صیغۂ واحد غائب میں شروع کیا ہے۔ کسی زمانے میں وسطی جرمنی کے ایک خوبصورت شہر ایرفُرت Erefurt میں ایک چھوٹی سی لڑکی رہتی تھی۔ Once upon a time کہہ کر انھوں نے اپنے بچپن کو ایک افسانوی رنگ دے دیا ہے۔ ایرفرٹ گوتھک گرجاؤں کا شہر ہے۔ یہیں لوتھر نے رہبانیت کا عہد کیا تھا، دورِ وسطیٰ کے ایک مشہور عارف مائسٹر ایکہارت Meister Echart نے یہیں اپنے وعظ دیئے تھے اور یہیں گوئیٹے نے نپولین سے ملاقات کی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انامری جیسی لڑکی کی پیدائش (۱۹۲۲ء) کے لیے یہ شہر موزوں تھا۔ اس کی قدامت پسند فضا میں ایک مذہبی رنگ تھا۔ بچپن میں شمل کو چرچ کی عبادات اور رسموں میں بڑا لطف آتا تھا۔ چرچ کے علاوہ شمل کی دلچسپی پریوں کی کہانیوں اور شعر و شاعری سے تھی۔ ایک کہانی "پدمنابھا اور حسن" انھیں بے حد پسند تھی۔ اس میں ایک ہندو ودوان ایک عرب کو گیان کے گر اور بھید بتاتا ہے۔ میرا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ہر طبع مذہب کے لیے موزوں نہیں ہوتی بالکل جس طرح ہر طبع سائنس یا ریاضی کے لیے موزوں نہیں۔ ویسے عبادات تو جو شخص چاہے ادا کر لے لیکن وہ مذہبیت جو انسان کی شخصیت کو گھیر لے اور اس ایک احساس ماورائیت اور سرّی بصیرت بخشے ہر ایک کے بس کی نہیں۔

شمل میں "یہاں تو طبع کی افتاد میں ہے ذوق سجود" والی بات تھی۔ وہ بالطبع صوفی منش تھیں۔ اسکول میں شمل کی اصل دلچسپی زبانوں سے تھی، فرانسیسی اور لاطینی سے۔ بعد میں کہتے ہیں انھوں نے بارہ زبانوں کی تحصیل کی جن میں یوروپ کی کئی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی، سندھی، اردو، تاجکی، ازبکی، پنجابی شامل ہیں۔ مذکورہ زبانوں میں ان کو سب سے زیادہ عبور، ترکی، سندھی اور عربی پر تھا۔ پھر فارسی اور اردو پر۔ برلن یونیورسٹی سے انھوں نے ۱۹۴۱ء میں پی ایچ ڈی کیا۔ یہ عین جنگ کا زمانہ تھا اور نازیت پورے جرمنی پر طاری تھی۔ یونیورسٹیوں میں بھی یہی قصہ تھا۔ اسی نازیت کے مرکز برلن میں ایسے بھی لوگ تھے جن کا تعلق میکس مولر، روکرٹ Ruckert اور گوئٹے کی روایت سے تھا۔ ان لوگوں میں آہستہ آہستہ انامری شمل سب سے زیادہ سربر آوردہ ثابت ہوئیں۔ مشرق کی روایات اور تہذیب سے شمل کو فطری لگاؤ تھا۔ چنانچہ پندرہ سال کی عمر میں انھوں عربی سیکھنی شروع کی ۔ اس مشرقی شوق کی ابتدائی محرک فریڈرش روکرٹ کی شاعری تھی ۔ روکرٹ نے کئی مشرقی شاہکاروں کے جرمن میں بڑے شاندار ترجمے کیے تھے۔ برلن میں پی ایچ ڈی کی تعلیم کے دوران شمل نے اسلامک آرٹ کے کورس بھی کیے۔ یہیں یونیورسٹی کی خاتون پروفیسر آنامری فان گابین Gabain نے انھیں ترکیات Turcology سے متعارف کیا۔ شمل اس پروفیسر کو اپنی بہن، اپنی آپا لکھتی ہیں۔

برلن سے ۴۶ء میں شمل ماربرگ چلی آئیں جہاں انھیں عربی اور اسلامیات کی پروفیسری کا عہدہ دیا گیا۔ یہاں انھوں نے اپنا افتتاحی ایڈرس دیا تو اسے بہت پسند کیا گیا لیکن جب انھوں نے ماربرگ جیسے قدامت پسند شہر کی یونی ورسٹی میں اپنا خطبہ ختم کیا تو فیکلٹی کی واحد خاتون پروفیسر لوایزے برٹ ہولڈ Luise Berthold نے اُن سے جو کہا اس سے اندازہ ہوتا ہے اس زمانے کی جرمنی کے معاشرے میں عورت کا کیا مقام تھا۔ شمل نے برٹ ہولڈ کے الفاظ نقل کر دیے ہیں جو یہ ہیں:

My dear child, remember one thing: men are our enemies.

بہت بعد میں جب شمل کو اندازہ ہوا کہ ماربرگ میں بحیثیت عورت کے ان کی ترقی کی ایک حد مقرر ہے تو انھیں لویزے کی بات یاد آئی۔

۱۹۵۰ء میں شمل انٹر نیشنل کانفرنس فار ہسٹری آف ریلیجن میں شرکت کے لیے ایمسٹرڈم گئیں جہاں اس موضوع کے دیو قامت علما جمع تھے۔ انھیں میں فرانس کے میسینان تھے جو شمل کو نور ہی نور لگے۔ انھیں دیکھ کر جسم کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔

۱۹۵۲ء میں شمل ترکی کے کتب خانوں میں اسلامی مخطوطات کے مطالعے کے لیے استنبول گئیں اور پہلی ہی نظر میں اس شہر کی گلی کوچوں اور یہاں کے لوگوں کی مروّت و مہمان نوازی نے ان کا دل موہ لیا۔ لوگوں سے گفتگو میں انھیں ترکی کے کلاسکی، ماضی کا علم ہوا۔ پھر اسی موقع پر وہ قونیہ گئیں جہاں صوفی شعرا کے سرخیل مولانائے روم (وفات ۱۲۷۳) کی نشانیاں موجود ہیں اور جو شمل کے محبوب شاعر ہی نہیں قریب قریب ان کے مرشد کا درجہ رکھتے ہیں۔ شمل نے لکھا ہے کہ اب قونیہ میں اونچی اونچی اپارٹمنٹ عمارتیں بن گئیں جنھوں نے روحانیت کو گویا شہر بدر کر دیا ہے لیکن جب ۵۲ء میں وہ وہاں گئیں تو اس کی فضا ہی الگ تھی۔ اپنے پہلے تجربے کو انھیں کے الفاظ میں سنیئے:

A thunderstorm at night transformed the greyish streets and a veritable paradise, the roads were filled with the heavy fragrance, of iqde (Musk willow), and I understood why Rumi's poetry is permeated with spring songs.

ترکی کا یہ دورہ شمل کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ یہاں انھوں نے شاعروں اور دانشوروں سے ملاقاتیں کیں اور انھیں ترکی کے مسائل کا پتہ چلا ایسے لوگوں کے مسائل جنھوں نے اپنا مقدس ورثہ، عربی رسم خط کھو دیا تھا اور اب اس شکنجے سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ استنبول میں شمل کی ملاقات سمیہا آئی وردی Ayverdi سے ہوئی جو ترکی کی بڑی شاندار شخصیت مانی جاتی تھیں۔ ان کی صحبت میں شمل "عثمانی" کو ترکوں کے کلچر اور اسلامی فنونِ لطیفہ کے لافانی حسن کا اندازہ ہوا۔

ترکی سے لوٹیں تو شمل کو جرمنی بڑا سرد مہر لگا۔ ماربرگ میں ان کو پتہ چلا کہ ان کی دوست نے جو بات مردوں کے بارے میں کہی تھی، صحیح ہی تھی۔ ماربرگ کو گوارا نہ تھا کہ ایک عورت اور وہ بھی ایسی عورت جو نہ صرف جوان تھی بلکہ جس نے مشرقی شاعری کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا تھا اسی طرز میں خود اپنی نظمیں لکھی تھیں اور جو، "لاحول ولا"، اسلام اور اس کی صوفی روایات کی اس قدر گرویدہ تھی ان کے درمیان رہے۔ لہٰذا جب انقرہ یونیورسٹی نے ان کو اسلامی دینیات کے نئے شعبے میں تاریخ

مذاہب کا درس دینے کی دعوت دی تو انھوں نے فوراً اسے قبول کیا۔ ان کو اپنے لکچر ترکی زبان میں دینے تھے جس میں انھیں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ ترکی کا نیا رخ یعنی وہ معاشرت جو اتاترک نے اس کے لیے پسند کی تھی شمل کو نہیں بھائی۔ اس اتاترکیت کا نتیجہ صرف ایک سستی امریکیت تھی جسے نئے ترک اپنی اسلامی اور قومی جڑوں کو ترک کر کے اختیار کر رہے تھے اور جس کے ردِ عمل کے طور پر ایک کٹر ملائیت پیدا ہو رہی تھی جسے Fundamentalism کہنے لگے ہیں۔ دونوں صورتیں بڑی ناپسندیدہ تھیں۔ بہر حال اگلے پانچ سال شمل نے ترکی میں گزارے۔ وہ لکھتی ہیں کہ یہ پانچ سال ان کی زندگی کا بڑا نشاط انگیز دور تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ ترکی شمل کے شعور میں ایک مرکزی مقام رکھتا ہے۔ یہاں انھوں نے کئی بار قونیہ کا دورہ کیا اور دسمبر ۱۹۵۴ء میں وہاں وہ مشہور ''زہے تقوی کہ من باجبہ دوستاری رقصم ''والا درویشوں کا رقص دیکھا جس کو مصطفی کمال نے ۱۹۲۵ء میں ممنوع کر دیا تھا۔ یہ رقص جسے ترکی میں سماک Samac کہتے ہیں اب محض ایک سیاحتی تماشا بن کر رہ گیا ہے۔

ان پانچ سالوں کے ختم پر شمل ماربرگ لوٹ آئیں اور جب وہ یہ سوچ رہی تھیں آگے کہاں جانا ہے تو ان کے لیے ایک نئی راہ کھلی۔ یہ علامہ اقبال کی شاعری تھی جس کے کلام میں شمل کے مطابق مشرق و مغرب، رومی اور گوئٹے یکجا ہو گئے ہیں۔ یہ نیا راستہ ان کو اس وقت ملا جب جرمن فلسفی روڈالف پان وتس سے ملاقات ہوئی۔ عرصہ پہلے پان وتس نے اقبال کی بعض نظموں کا ترجمہ جرمن میں کیا تھا۔ اس کے تشکر میں اقبال نے اپنی دو کتابیں پان وتس کو تحفتاً دی تھیں لیکن چوں کہ پان وتس کو فارسی بہتر نہیں آتی تھی کسی نے یہ دو کتابیں شمل کے حوالے کیں۔ یہ تھیں، پیام مشرق اور جاوید نامہ۔ جاوید نامہ کا شمل نے جرمن میں منظوم ترجمہ کیا اور پھر ترکی کے دوستوں کے اصرار پر ترکی نثر میں اس کا ترجمہ تبصرے کے ساتھ شائع کیا۔ اس طرح شمل کے لیے پاکستان کا راستہ کھلا۔ ترکی کے بعد پاکستان شمل کے کام اور دلچسپی کا مرکز بن گیا۔ انھوں نے اس ملک کے کوئی تیس دورے کیے، کونے کونے گئیں، یہاں کی تہذیب اور سیاست کو دیکھا اور اقبال اور اسلام پر بے شمار لکچر دیے۔ پاکستان میں سب سے زیادہ وہ سندھی زبان اور سندھ کی صوفی بھکتی روایت کی گرویدہ ہو گئیں جس کے سب سے بڑے نمائندہ شاہ عبد اللطیف بھٹائی ہیں۔ سندھ کی بے شمار چھوٹی چھوٹی درگاہوں پر انھوں نے حاضری

دی اور یہاں کی روحانی روایت اور فضا کو پوری طرح جذب کیا۔ عجیب لگتا ہے کہ شمل نے سندھ کی وڈیرہ تہذیب اور اسکے جبر کا تذکرہ بالکل نہیں کیا ہے، کم از کم زیر نظر لکچر میں نہیں کیا ہے۔ ان کی روش کچھ وہ لگتی ہے جو جگرؔ نے اس شعر میں بیان کی ہے:

ان کا جو کام ہے ارباب سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

شمل لکھتی ہیں وہ پاکستان میں اپنے آپ کو بالکل اپنے وطن میں محسوس کرتی تھیں۔ پاکستان نے بھی ان کی بہت قدر کی، ان کو "ہلال پاکستان" کا سب سے بڑا غیر فوجی اعزاز دیا اور ان کی یادگار مہمان نوازی کی۔ پاکستان ہی نہیں شمل کو پورا برصغیر عزیز تھا۔ جب بھی وہ حیدرآباد آئیں، انھوں نے اورنگ آباد، گلبرگہ، بیدر اور بیجاپور کا دورہ کیا۔ بیجاپور پر انھوں نے ایک یادگار سلائیڈ لکچر دیا تھا جو حیدر آباد میں لوگوں کو اب تک یاد ہے۔

بون میں وہ پروفیسر تھیں ہی، ہارورڈ آنے کی تحریک پہلے پہل کیٹویل اسمتھ نے دی۔ جسے بڑے پس و پیش کے بعد شمل نے قبول کر لیا اور ۱۹۶۷ء میں ہارورڈ میں شمل کی دو مشکلیں تھیں۔ ایک اس زبان کی جس میں انھیں لکچر دینے تھے۔ ترکی میں وہ بڑے اعتماد سے لکچر دے سکتی تھیں لیکن انگریزی پر ان کی قدرت کچی پکی تھی۔ اسکول میں وہ صرف انگریزی ہی میں فیل ہو چکی تھیں۔ دوسرے جہاں جرمن میں مشرقی شاعری کے بڑے شاندار ترجمے موجود تھے، انگریزی میں وہ دستیاب نہیں تھے۔ ہاروڈ پہنچنے سے پہلے شمل ایران سے افغانستان ہوتی ہوئی برصغیر پہنچیں جہاں انھوں نے کثرت سے اردو اور فارسی کتابیں خریدیں۔ ہارورڈ کتب خانے میں اردو کتابیں برائے نام تھیں، شمل نے اتنی کتابیں جمع کیں کہ اب وہ اردو اور سندھی کے اعلیٰ ترین کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔ جب پہلے پہل شمل ہارورڈ پہنچیں تو اُن کے شریک کار نے ان سے کہا تھا کہ ہاروڈ ایسی جگہ ہے جہاں آدمی بڑا تنہا ہو جاتا ہے۔ لیکن شمل کے شاگردوں نے جو زیادہ تر ہند و پاک، ایران، عرب یا امریکہ کے مغربی ساحل کے تھے ان کو عزت و محبت دی اور انھیں تنہائی کا احساس ہونے نہیں دیا۔ آہستہ آہستہ شمل ہارورڈ کی علمی سوسائٹی

میں مقبول ہوتی گئیں، امریکن کونسل آف لرنیڈ سوسائیٹیز میں کئی لکچر دیے اور ایک اہم انسائیکلوپیڈیا آف رلیجن کے ایڈیٹروں میں ان کا انتخاب ہوا۔

اپنے اس معرکتہ الآرا لکچر میں جس سے میں نے اپنی تقریر کا مواد لیا ہے، شمل نے ہارورڈ اور امریکہ کا اتناذکر نہیں کیا ہے جتنا افغانستان کے کوہ وصحرا، استامبول، انقرہ اور اناطولیہ کے مناظر، لاہور، اسلام آباد اور کراچی کے شہروں، سندھ کے ریگ زار میں جابجا نمودار اولیا کے مزاروں اور رومی، اقبال اور حلاّج کی بات کی ہے۔ پدمنابھ اور حسن کا قصہ انھیں برابر یاد رہا ہے۔ ہلال پاکستان کے علاوہ شمل کو مصر کا آرڈر آف میرٹ کا تمغہ ملا جسے وہ وہ اپنا اولمپک مڈل کہتی تھیں۔ اور بھی کئی اعزاز ملے لیکن اپنی ساری شہرت اور علمیت کے باوجود ان کو اپنے عورت ہونے اور اسلام سے ایسی والہانہ دلچسپی رکھنے کی قیمت چکانی پڑی۔

اکتوبر ۱۹۹۵ء میں جب جرمن بک ٹریڈ ایسوسی ایشن نے انھیں اپنا بہت ہی باوزن اور قیمتی انعام (جرمن کا نوبل انعام) دینا چاہا تو ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنی سخت مخالفت اس کی ہوئی کہ فیڈرل پبلک آف جرمنی کے پریسیڈنٹ ہر رومان ہیر تساگ Herr Roman Herzog نے اپنے افتتاحی خطبے میں اسے Fierce Controversy کا نام دیا ہے۔ سیکڑوں جرمن مصنفوں اور ناشروں نے بک ٹریڈ اسوسی ایشن پر اعتراض کیا۔ روزنامہ ہندو کی رپورٹ کے مطابق پانچ سو جرمن دانشوروں نے ایک دستخطی عرضداشت اس انعام کے خلاف پیش کی۔ ان لوگوں کا اعتراض یہ تھا کہ شمل نے ایران کی کٹر ملائیت، خصوصاً ۱۹۸۹ء کے سلمان رشدی کے خلاف خمینی کے فتوے کی ایسی شدید مذمت نہیں کی جیسی دوسرے دانشوران مغرب نے کی تھی۔ انھوں نے رشدی کے خلاف holy wars کو تورد کیا لیکن مئی ۸۹ء کے ایک انٹرویو میں یہ بھی کہا تھا کہ: ”میں سمجھتی ہوں کہ کوئی مصنف اگر شعوری طور پر پیغمبر اسلام کی توہین کرتا ہے، اور رشدی صاحب جانتے ہیں کہ عالم اسلام میں (حضرت) محمد ﷺ کو کس عقیدت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، تو وہ بے حرمتی Sacrilege کا مرتکب ہوتا ہے۔“

بک ٹریڈ اسوسی ایشن کا امن انعام قبول کرتے ہوئے جو تقریر شمل نے کی اس میں انھوں نے کہا ہے کہ جو مہم میرے خلاف اس زور شور سے چلائی گئی اور جس میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو مجھے

جانتے تک نہیں، اس نے مجھے بڑا گہرا دکھ پہنچایا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا ساری عمر کا کام جس کا مقصد مشرق و مغرب کو ایک دوسرے کے قریب لانا رہا ہے۔ اکارت ہو گیا۔ میں صرف یہ امید کر سکتی ہوں کہ وہ لوگ جنھوں نے میری مخالفت کی ہے انھیں ایسے عذاب سے کبھی گزرنا نہ پڑے جس سے میں گزری ہوں۔ میں نے اس تباہ کن فتوے پر ہمیشہ لعنت بھیجی اور آزادی رائے کی ہمیشہ تائید کی اور اپنے طرز پر آئندہ بھی کرتی رہوں گی۔ ایسا لگتا ہے کہ اس تقریر کے موقع پر انامری شمل پر کچھ ایسا ہی دباؤ تھا جیسا ان لوگوں کا دباؤ ہوتا ہے جنھیں اساس پرست fundamentalist کہا جاتا ہے۔ ہر کس بہ خیال خویش خبطے دارد۔

شمل نے اپنے اس خطبے میں یہ بتایا کہ مغرب میں اسلام کی ایک یک رخی تصویر ہے جو اسلامی تہذیب کی اس وسعت اور تنوع کو اپنے دائرے سے خارج کر دیتی ہے جو ایران و عرب سے ہندوستان اور انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے۔ شمل نے یہاں ادب اور شعر کی قوت اور معنی خیزی کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ میں نے استنبول جیسے لاجواب شہر کو ان اشعار کے ذریعہ دریافت کیا جو پانچ صدی سے پہلے تخلیق ہوتے رہے ہیں اور پاکستان کے کلچر کو اسی شعر کے ذریعہ سمجھا جو اس ملک کے کونے کونے میں گونجتا ہے۔ شمل اسلام کے صوفی قلب کو جانتی تھیں ۔ انھوں نے لکھا ہے کہ تصوف غفلت اور Obscurantism نہیں ہے جیسا مغرب میں بہت سے لوگ سمجھتے ہیں ۔ وہ ابتدائی صوفی ہی تھے جنھوں نے ناانصافی اور سیاسی جبر کے خلاف اپنی بے خوف آواز اٹھائی، شاہوں کو للکارا

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

اس صوفی روایت کی سب سے اونچی چوٹی پر شمل نے منصور حلاج اور دار کو دیکھا ہے۔ ان کی اس بات پر میر کا شعر یاد آتا ہے کہ:

موسم آیا تو شاخ دار پر میرؔ سر منصور ہی کا بار آیا

خیر یہ داستان نہ صرف دراز بلکہ پیچیدہ بھی ہے۔ اسے یہیں چھوڑتے ہیں۔ شمل کا علمی ادبی کارنامہ اتنا وقیع اور وسیع ہے کہ اس پر فی الحال بات نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ ان کا وہ کام

الگ ہے جو کہ ترکی سندھی اور ان کی اپنی زبان جرمن میں ہے۔ شمل کے ہیکنس Haskins لکچر کے دو تین جملے بہت اہم ہیں جو میں یہاں دہراتا ہوں۔ ”میری دائرہ در دائرہ زندگی علم کی مسلسل جستجو میں گزری ہے ... علم میرے لیے اسی وقت علم ہے جب وہ تجربے، دانش مندی، یگانگت اور پختگی میں ڈھل جائے۔ شمل نے تاریخ کے واقعاتی مدوجزر کے ماورا ایک ابدی قوت کو محسوس کیا ہے۔ لکھتی ہیں:

.... One tends (at least I do) to look out for the unchangingpower behind the fluctuating surface of events.

شمل کی ایک اور بات میرے دل کو لگی کیوں کہ عرصے سے میرا بھی یہی خیال رہا ہے۔ انھوں نے یہ بات مذاہب کے مظاہری Phenomenological مطالعے کے ضمن میں کی ہے۔ ان کے خیال میں مذاہب کے مطالعے کا یہ طریقہ یا approach ایسا ہے کہ اس کے ذریعے آدمی آہستہ آہستہ مذاہب کی روح تک پہنچ سکتا ہے۔ میں ان کا جملہ دہراتا ہوں:

I was and still am convinced that such an approach can lead to much needed tolerance without losing oneself in sweeping, dangerous "syncretistic" views that blur all differences.

شمل نے مزید لکھا ہے کہ ان سے لوگ اکثر پوچھتے ہیں کہ کیا ایسی زندگی جو ٹائپ رائٹر، کتابوں اور لکچروں کے درمیان گزرے تھکانے والی نہیں ہوتی؟ ان کا جواب یہ ہے کہ ہاں ہوتی ہے، لیکن کسی لکچر کے بعد ناشتے، لنچ یا ڈنر پر جو تخلیقی اور خیال آفریں گفتگو ہوتی ہے وہ زندگی میں ایک لطف اور نیا ولولہ پیدا کر دیتی ہے۔ ایک سوال البتہ ایسا ہے جس سے وہ ہمیشہ جھلا اٹھتی ہیں۔ وہ یہ کہ آپ کو ایک عورت ہونے کے باوجود اسلام سے کیسے دل چسپی پیدا ہوئی؟ گویا اسلام اور عورت ایک دوسرے کے منافی ہیں۔

آخر میں ایک شام کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اپنے ماحول اور فضا کی وجہ سے نہ صرف یادگار تھی بلکہ اس میں انامری شمل کی شخصیت کا پرتو شامل تھا۔ غالباً ۸۶ء کی بات ہے جب آخری بار شمل یہاں آئی تھیں۔ انھوں نے اپنی طرف سے چند لوگوں کی دعوت کی اور میری خوش قسمتی کہ مجھے بھی ان میں شامل کیا۔ یہ دعوت انھوں نے پرانی حویلی میں دی تھی اور کھانے کا انتظام محترم مجیب یار جنگ کے

حوالے تھا۔ جن سے شمل کی بڑی دوستی تھی۔ شام گہری ہو چکی تھی جب میں اور میری بیوی قامتہ آٹو میں بیٹھ کر پرانی حویلی کے وسیع احاطے میں داخل ہوئے نیم تاریکی اور درختوں کے ہولے۔ ایک عجیب ویرانی سی تھی۔ آٹو چلتا رہا اور بالآخر جب منزل پر پہنچے تو پرانی حویلی ایک جناتی محل لگ رہی تھی۔ مجھے یاد ہے شمل نے یہی لفظ استعمال کیے تھے۔ حویلی کا صرف بیرونی برآمدہ کھلا تھا۔ صرف چند لوگ جمع تھے، ڈاکٹر اور مسز شکیب، ڈاکٹر فیاض قادر اور ان کی جرمن بیوی، مجیب یار جنگ کی بھاری بھرکم، پروقار شخصیت کچھ اور لوگ، بس کوئی آٹھ دس۔ روشنی یہاں بھی مدھم تھی اور اس وسیع برآمدے کے ایک کونے میں ہم لوگ بیٹھے تھے۔ کھانا شروع ہوا، اتنا لذیذ کہ ہم نے شاید ہی کبھی کھایا ہو۔ کھانا ختم ہوا تو موسیقی کی باری آئی۔ ساز کھلے اور قوال کی دلکش آواز ابھری۔ شمل نے سراج اورنگ آبادی کی مشہور غزل کی فرمائش کی:

خبر تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو میں رہا نہ تو تو رہا جو رہی سو بے خبری رہی
چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نیم تاریکی اور پرانی حویلی کی اتھاہ خاموشی یہ غزل ہم لوگوں کے دل و جان پر چھا گئی۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ صوفی کا روحانی تجربہ کیا ہوتا ہوگا۔ شمل خاموش بیٹھی سنتی رہیں محویت ان کے مزاج میں تھی۔

یہ تھیں اپنی میری شمل اورینٹلسٹ، اسلامالوجسٹ، ماہر اسلامیات، عالم بے بدل لیکن ان سب سے زیادہ الفقیرۃ الی رحمۃ ربی –

مراجع:

سراج الدین، سید۔ "اپنی میری شمل کی یاد میں"۔ اقبال ریویو، نومبر ۲۰۰۳۔ ۶۹-۷۹۔

(بشکریہ، اقبال ریویو، حیدرآباد، نومبر ۲۰۰۳ء)